ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

دسمبر ۲۰۱۸

www.inzaar.pk

December 2018

اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں اس کا دینا بلاشبہ اس کی عطا ہے مگر
اس کا بظاہر کچھ لے لینا بھی ایک روز اس کی عطا بن کر ہی سامنے آئے گا

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ماہنامہ

اِنذار

دسمبر 2018ء ربیع الاول/ربیع الثانی 1440ھ

جلد 6 شمارہ 12

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ — 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.

فون: 0332-3051201, 0345-8206011

ای میل: globalinzaar@gmail.com

کیا جنت کی طلب لالچ ہے؟

اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کا بدلہ جنت یا اس کی نعمتوں کی شکل میں لیا جائے، یہ بات کچھ لوگوں کو بہت معیوب لگتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ لالچ کے جذبے سے نیکی کرنا ہے جو ایک غلط چیز ہے۔ ایسے خیالات کا عکاس اقبال کا یہ مشہور شعر ہے۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اس طرح کے لوگ قرآن مجید میں جنت اور نعمتوں کے بیان کو شرف انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ان چیزوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ تاہم اس طرح کی باتیں دیکھنے اور سننے میں کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ لگیں، خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر حال میں بدلہ چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت کوئی انسان یہ کہتا ہے کہ مجھے کوئی بدلہ نہیں چاہیے، اس وقت بھی وہ بدلے میں ایک روحانی سکون ضرور لے رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص مادی بدلے کی خواہش نہیں رکھتا، مگر بہر حال وہ ایک غیر مادی بدلے یعنی اطمینان اور سکون کو ضرور چاہتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان ایک مخلوق اور بندہ عاجز ہے۔ وہ ہر ہر قدم پر اپنے مالک کی عنایات کا محتاج ہے۔ وہ سانس لینے، پانی اور غذا نگلنے اور دیگر بنیادی ضروریات تک کے لیے بھی اپنے رب کی مدد کا محتاج ہے۔ جو بندہ اتنا عاجز ہو، اسے اس طرح کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف اللہ رب العالمین کی ہستی ہے جو الغنی یعنی جو ہر ہر پہلو سے بے نیاز اور ہر قسم کی محتاجی سے پاک ہے۔ باقی ہر شخص محتاج ہے اور نعمت کے بغیر جی نہیں سکتا۔ جنت کی طلب اسی بات کا اعتراف ہے نہ کہ کسی قسم کے لالچ کا اظہار ہے۔

خیر کا راستہ

کوئی حکمران شیطان ہوتا ہے نہ فرشتہ ہوتا ہے۔ اپنی قوم کو یہ حقیقت سمجھاتے سمجھاتے یہ طالب علم جوانی سے بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکا ہے، مگر لوگ سمجھ کر نہیں دیتے۔ ہم سات دہائیوں کی حماقتوں کے باوجود بھی کچھ سیکھنے کو تیار نہیں۔ ڈالر کی قیمت 3 روپے سے لے کر 135 تک پہنچ گئی، ملک دولخت ہو گیا، ہمارا سوشل فیبرک تباہ ہو گیا، مگر ہم کچھ سمجھنے کو تیار نہیں۔

ہماری دانشور قیادت پچھلی سات دہائیوں سے ایک ہی کام کر رہی ہے۔ وہ یہ کہ ہر برائی حکمران وقت کے سر تھوپ دی جائے۔ اسے ابلیس ملعون ثابت کر دیا جائے۔ جب ہم یہ کر کے حکمران سے جان چھڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملک تباہی کی مزید منازل طے کر چکا ہے۔ ایوب خان، یحییٰ خان، بھٹو، ضیاالحق، نواز شریف، بے نظیر، پرویز مشرف اور زرداری...... اپنے اپنے لحاظ سے ہم نے ان سب کو شیطان ثابت کیا اور ان سے جان چھڑائی۔ مگر جب نیا حکمران آیا تو معلوم ہوا کہ عوام کے لیے ایک زیادہ بڑی مصیبت کھڑی ہو چکی تھی۔

حکمرانوں میں خرابیاں ہوتی ہیں۔ مگر قومیں حکمرانوں کی خرابیوں سے تباہ نہیں ہوتیں۔ قومیں اس فکری قیادت کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہیں جو جذباتیت، منفی اندازِ فکر اور ٹکراؤ کی سوچ پیدا کرتی ہے۔ جو اپنے احتساب کے بجائے ہر مسئلے کو دوسروں پر ڈالنے کا سبق سکھاتی ہے۔ جو ہر حکمران کو شیطان بنا کر باقی خرابیوں سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

یہ فکری قیادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے بالکل برعکس قوم کی تربیت کر رہی ہے۔ ان احکام سے کتب حدیث بھری ہوئی ہیں۔ ہمارے اسلاف نے ان احکام پر عمل کیا۔ حکمرانوں پر تنقید ضرور کی، مگر اپنا رخ معاشرے کی اصلاح کی طرف کیے رکھا۔ یہی ہمیں کرنا ہے۔ صبر کے ساتھ، برداشت کے ساتھ۔ سارا خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کیے ہوئے اسی طریقے میں ہے۔ ہمیں اسی کو اپنانا ہوگا۔

دیانت داری

دیانت داری (honesty) کا وصف کسی معاشرے کی زندگی کا ضامن ہے۔ دیانت دار انسان وہ ہوتا ہے جو جھوٹ اور فریب سے پاک ہو اور اپنے اوپر عائد ذمہ داری کو پوری صلاحیت استعمال کر کے ویسے ہی نبھائے جیسے اسے نبھائے جانے کا تقاضا ہو۔ دیانت داری اسی آخری چیز کا نام ہے اور لوگ اسی سے بچنے کے لیے لوگ جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتے ہیں۔

اس پیمانے پر اگر جانچا جائے تو ہم میں سے بیشتر لوگ دیانت داری کے وصف سے کلی یا جزوی طور پر خالی ہیں۔ صرف اخلاقی بنیادوں پر اپنی ذمہ داریاں پوری طرح نبھانے والے لوگ ہمارے معاشرے میں کم ہی ملتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نمونہ سرکاری ملازمت کا شعبہ ہے جہاں ملازموں کو ملا ہوا تحفظ اور ان کی کارکردگی جانچے بغیر محض سینیارٹی کی بنیاد پر ان کی تنخواہ میں مسلسل اضافہ ملازموں کو اس بات سے بے نیاز کر دیتا ہے کہ وہ اخلاقی بنیادوں پر اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔ جس کے بعد لوگ جھوٹ اور فریب کو استعمال کر کے اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں۔ اس کا اگلا مرحلہ کرپشن یا بد دیانتی کا ہے جس میں لوگ مالی منفعت کے لیے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے یا اسے رشوت، کمیشن اور بدعنوانی سے مشروط کر دیتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ہر وہ شعبہ جہاں کوئی براہ راست نگرانی نہ کرے یا پھر کسی کی پکڑ کا خوف نہ ہو وہاں دیانت داری عنقا ہو چکی ہے۔ یہاں عام لوگ شاید کرپٹ نہ ہوں مگر باتیں بنا کر، جھوٹ بول کر اور فریب دے کر اپنی ذمہ داری سے بھاگنے کا کام ایک مزدور سے لے کر تاجر تک سب ہی کرتے ہیں۔ یہ وہ دیمک ہے جو ہمارے معاشرے کو تیزی سے کھا رہا ہے۔

اگر ہمیں اپنے معاشرے کو تباہی سے بچانا ہے تو دیانت داری کے وصف کو پوری طرح اپنانا ہوگا۔ ورنہ دیمک زدہ لکڑی چاہے باہر سے کیسی ہی مضبوط لگے، آخر کار کھوکھلی ہو کر گر جاتی ہے۔

بے کردار اسلام پسندی

پچھلے کچھ عرصہ سے پے در پے ایسے واقعات پیش آرہے ہیں جن سے عوام الناس کا اعتماد اسلام کے نام پر کھڑی لیڈر شپ پر سے اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ پچھلے دو تین برسوں میں مغرب میں موجود بعض نمایاں مسلم اسکالر اور اس سے قبل خود ہمارے اپنے ملک کے بعض علماء کے سیکس اسکینڈل بہت مشہور ہوئے۔ اسی طرح عشق کے جذبے سے سرشار بعض خدامِ دین اور پھر حال ہی میں اسلام کا حوالہ دیتے رہنے والے دو معروف صحافیوں کی تہذیب و شائستگی سے گری ہوئی گفتگو کے منظر عام پر آنے سے عام لوگوں کا دین پر اعتماد مجروح ہوا ہے۔

یہ تو وہ چیزیں ہیں جن کو ہمارے معاشرے میں کچھ برا سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ جو برائیاں ہماری لیڈر شپ تاویل کے راستے سے اختیار کیے ہوئے ہے یا جن کو برا ہی نہیں سمجھا جاتا ہے، ان کے بارے میں تو عوام الناس میں بھی وہ حساسیت نہیں جو خود دین کا تقاضا ہے۔ حالانکہ ہماری مذہبی اور فکری لیڈر شپ علانیہ اور تسلسل کے ساتھ اسلام کے نام پر ان برائیوں کا ارتکاب کر رہی ہے۔ جیسے دہشت گردوں کی حمایت، فرقہ وارانہ منافرت کا فروغ، اہل علم کے خلاف جھوٹی مہمیں اور بہتان و دشنام کا وہ سلسلہ جس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

اس بے کردار اسلام پسندی کا ظہور اس دور میں ہو رہا ہے جس میں اسلام کے نام پر جنم لینے والی فعالیت اور سرگرمی (Activism) کی نظیر ماضی میں کبھی نہیں ملتی۔ احیائے اسلام کے اس خواب کو تو جانے دیجیے جس کے لیے بے پناہ قربانیاں دی گئیں اور جان و مال کی زبردست جدوجہد کی گئی اور جو خواب اس ساری جدوجہد کے باوجود ہنوز تشنہ تعبیر ہے، مگر اخلاقی معاملات میں جو رویہ پیروکاروں سے بڑھ کر لیڈر شپ میں نظر آتا ہے اور جس کی کچھ مثالیں اوپر گزریں، اس کے بعد یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اس خرابی کو دریافت کیا جائے جس کی بنا پر اتنی غیر معمولی کوشش ایسے نتائج کا باعث بنی ہے۔

ہمارے نزدیک اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ قرآن مجید ایمان واخلاق کی جس دعوت کو نجات کی کنجی قرار دیتا ہے اور جس کی بنیاد پر صحابہ کرام سے دنیا میں غلبہ اور اقتدار کا وعدہ کیا گیا تھا، وہ ہمارے موجودہ مذہبی فریم ورک میں بالکل غیر اہم ہوچکی ہے۔ اس کی جگہ فرد کے ظاہری حلیے کی تبدیلی، سیاسی انقلابی سوچ، فرقہ وارانہ تعصّبات، عشق ومحبت کے زبانی دعوے، ماضی پر فخر اور دوسروں کا احتساب جیسے تصورات نے لے لی ہے۔ یہ ہماری مذہبی فکر کا کل سرمایہ ہے۔ اس سرمائے سے آپ اعلیٰ انسان پیدا نہیں کرسکتے۔ اس سے وہی مثالیں جنم لیں گی جن کا ذکر پیچھے ہوچکا ہے۔

اس کے برعکس ایمان واخلاق کی وہ دعوت، جس سے قرآن مجید کے صفحات بھرے ہوئے ہیں اور جس کا زندہ عکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی ہستی میں دیکھا جاسکتا تھا، یہ دعوت اعلیٰ انسانوں کو جنم دینے کا ایک سائنسی فارمولا ہے۔ یہ دعوت خدا کے حضور پیشی کو سب سے بڑا مسئلہ اور آخرت کی نجات کو سب سے بڑی کامیابی بنادیتی ہے۔ اس کے مقصد کے حصول کے لیے جو پہلا ہدف ایمان واخلاق کی یہ دعوت انسان کے سامنے رکھتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے ہر گروہی تعصب، فرقہ وارانہ ذہن اور ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ جائے۔ یہ دعوت انسان کو اشتعال کے بجائے صبر میں جینا سکھاتی ہے۔ یہ خواہش اور شہوت کو جائز حدود تک محدود رکھنے کا درس دیتی ہے۔ یہ دوسروں کے احتساب کے بجائے اپنے احتساب پر متوجہ کرتی ہے۔ یہ الزام و بہتان کے بجائے علم و تحقیق پر زور دیتی ہے۔ یہ نفرت کے بجائے خیر خواہی اور عداوت کے بجائے دعوت کا ذہن پیدا کرتی ہے۔

یہ دعوت جو آخرت میں باعث نجات ہے، یہی دنیا میں بھی عروج وترقی کی ضامن ہے۔ یہ وہ بات ہے جو ہم اپنی قوم کو زندگی کی آخری سانس تک سمجھاتے رہیں گے۔ اس لیے کہ یہی انبیا علھیم السلام کا مشن ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز انبیا کی دعوت ہے نہ ان کا مقصود۔

آسیہ کیس اور اہل مذہب کی خدمت

گستاخی رسول کے الزام میں گرفتار آسیہ بی بی کو سپریم کورٹ نے بری کر دیا۔اس کے بعد معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ایک طرف مذہب کے نام پر کھڑی جماعتیں اور ان کی حمایت کرنے والے لوگ ہیں جن کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آیا ہے۔احتجاج، دھرنے، مظاہرے اور تشدد کا سلسلہ جاری ہے اور نجانے کب تک جاری رہے گا۔دوسری طرف کم و بیش باقی تمام معاشرہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی ہی محبت رکھتا ہے جتنی محبت کے دعویدار احتجاج کرنے والے لوگ ہیں۔

پہلے گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مغربی طاقتوں کے ایجنڈے کے تحت آسیہ بی بی کو بری کیا گیا ہے۔جبکہ دوسری طرف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آسیہ بی بی پر سلمان رشدی یا اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کی طرح علانیہ اور تسلسل کے ساتھ کسی گستاخی کا کوئی الزام نہیں۔یہ ایک خاص واقعہ تھا جو کچھ لوگوں کے بیچ میں پیش آیا۔دو عورتوں یعنی معافیہ بی بی اور اسماء بی بی کے سوا اس واقعے کا کوئی گواہ نہیں۔جب یہ حقیقت ہے تو اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ اس قضیے کا فیصلہ عدالت ثبوت اور گواہی کی بنیاد پر کرے کہ اصل میں ہوا کیا تھا۔

اب عدالت میں ہوا یہ کہ آسیہ نے اس الزام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔سپریم کورٹ نے واضح طور پر اپنے فیصلہ میں لکھا ہے کہ گواہوں کے بیانات میں تضادات ہیں۔واقعے کی ایف آئی آر پانچ دن بعد درج کرائی گئی۔الزام لگانے والی دو خواتین یعنی معافیہ بی بی اور اسما بی بی نے یہ بات چھپائی کہ ان کا آسیہ بی بی سے پانی پلانے کے معاملے پر جھگڑا ہوا ہے۔جبکہ کھیت مالک محمد ادریس نے اس جھگڑے کو تسلیم کیا۔مزید یہ کہ اس واقعہ کے وقت موجود پچیس تیس خواتین میں سے کوئی بھی ان دونوں کی تائید میں گواہی دینے پیش نہ ہوئیں۔ان تمام چیزو

ں نے شک کو جنم دیا ہے۔ قانون کی روایت ہے کہ جب شک پیدا ہو جائے تو فائدہ ملزم کو ملتا ہے۔ چنانچہ آسیہ بی بی کو رہا کر دیا گیا۔ ان سب کے ساتھ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں ہائی کورٹ کے فیصلے کے کمزور پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے اسے رد کرنے کی وجہ بھی بیان کی۔

اس لیے ہماری ناقص رائے میں اس فیصلے کے بعد احتجاج اور مظاہرہ اگر ہونا چاہیے تو اس مقدمے کے گواہوں کے خلاف ہونا چاہیے کہ انھوں نے عدالت میں متضاد بیانات کیوں دیے یا ان لوگوں کے خلاف جنھوں نے یہ مقدمہ تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مذہبی حلقے ہماری اس تجویز کو سنیں گے اور نہ مانیں گے۔ وہ وہی کریں گے جو کر رہے ہیں۔ مگر اب ذرا دل تھام کر اس رویے کے وہ نتائج سنیے جو آنے والے برسوں میں نکلیں گے۔

پچھلی کئی دہائیوں کی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے بعد یہ معاشرہ پہلے ہی اہل مذہب سے بیزار ہو چکا ہے۔ اس وقت پڑھے لکھے لوگوں کی صورتحال یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مذہبی لوگوں سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ کسی رشتے کا معاملہ ہو تو سخت مذہبی لڑکے لڑکیوں کا ذکر آتے ہی ان کو ریجکٹ کر دیا جاتا ہے۔ ایسے میں بعض عشاق نے گالیوں، بدزبانی اور تشدد پر مبنی ایک نیا مذہبی رجحان متعارف کرا دیا ہے۔

اس رجحان کے ساتھ ایسے کسی موقع پر کیے گئے مظاہروں میں معمولاتِ زندگی کو مفلوج کرنے، تشدد اور جان و مال کے نقصان کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس کی کوئی اخلاقی اور مذہبی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ ملک کی ساٹھ فیصد آبادی کی عمر تیس برس سے کم ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ معاشرے کی باگ دوڑ سنبھالے گی تو وہ اہل مذہب ہی نہیں بلکہ خود مذہب سے بھی بیزار ہو چکی ہوگی۔ یہ وہ خدمت ہے جو مذہب کے نام پر کھڑے لوگ اس وقت سرانجام دے رہے ہیں۔ کاش انھیں احساس ہو جائے کہ کیسا ستم ہے جو یہ مذہب کے نام پر خود مذہب پر ڈھا رہے ہیں۔

سلام اس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں

گستاخی رسول کا مسئلہ پچھلے دس پندرہ برسوں سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہر تھوڑے عرصے بعد کسی نہ کسی پہلو سے تازہ ہوجاتا ہے۔ ان برسوں میں ہم نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا دہرانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان کا تعلق خود ہماری محبوب ہستی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ شخصیت، وقار اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کے ساتھ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلوم انسانی تاریخ کی سب سے بڑی، سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ باکمال شخصیت ہیں۔ یہ بات ہم عقیدتاً نہیں کہہ رہے بلکہ حقیقت یہی ہے کہ معلوم انسانی تاریخ آپ جیسی بے مثل کسی دوسری ہستی کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھتی۔ آپ کی عظمت کی وجہ بحیثیت نبی اور رسول آپ کے مشن کی کامیابی نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر وہ عظیم اخلاق اور بے مثل کردار تھا جس کا مظاہرہ ایک حکمران اور پیشوا ہونے کے باوجود آپ نے عمر بھر کیا۔

آپ کی اس بے مثل شخصیت کا سب سے غالب پہلو وہی ہے جسے قرآن نے رحمت للعالمین کہہ کر نمایاں کیا۔ یہ ابر رحمت جب برسا تو دوست تو کجا دشمن بھی اس کی عنایتوں سے محروم نہ رہے۔ بدترین دشمنوں نے بھی آپ سے معافی، درگزر، رحم کے سوا کچھ نہیں پایا۔ اسی بے مثل شخصیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ آپ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہ لیا۔ مکہ میں کفار نے آپ کو بدترین سَبّ وشتم اور تمسخر واستہزا کا ہدف بنایا۔ مدینہ میں یہی کام منافقین اور یہود نے اپنے طریقے سے کیا۔ مگر جواب میں صبر، درگزر، معافی اور رحم کے سوا کچھ نہ پایا۔

یہ وہ بے مثل ہستی ہے جس کے بارے میں آج کے مسلمان ہمیں آئے دن یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رحمت للعالمین نے فلاں فلاں کو گستاخی کے جرم میں قتل کرایا۔ سوال یہ ہے

کہ اس طرح کی باتیں کرنے والے لوگ رحمت للعالمین کے بارے میں ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہیں کہ معاذ اللہ نبئ رحمت کا ظرف اتنا کم تھا کہ کسی بدبخت کی زبان درازی کا تحمل نہ کر سکتا تھا۔ باخدا ایسی کوئی بھی بات رسول خدا کی عظمت سے فروتر ہے۔ آپ کی ہستی وہ سورج ہے جو ہر بے ہودہ گو کی پہنچ سے بہت بلند اور اعلیٰ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ یہ نقطہ نظر کس طرح غلط ہے، ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہم پاکستان میں گستاخی رسول کے کسی قانون کے خلاف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ابتدائی زندگی کا ایک بڑا حصہ بریلوی مکتب فکر کے زیر اثر گزارا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق سارے اہل حدیث اور دیوبندی حضرات ہی گستاخ رسول ہیں۔ اس کا ایک علانیہ نمونہ جنید جمشید مرحوم کے معاملے میں سامنے آ چکا ہے۔ اس وقت بھی ہمارے سماج میں گستاخی رسول کے بیشتر مقدمات غیر مسلموں کے خلاف نہیں بلکہ وہ ہیں جو بریلویوں نے دیوبندیوں اور اہل حدیث حضرات کے خلاف درج کرا رکھے ہیں۔ کوئی قانون اگر نہیں ہوگا تو پھر سارے فیصلے سڑکوں پر ہی ہوں گے۔ اس لیے ہم قانون کو تو ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ رحمت للعالمین نے اس طرح کا کوئی قانون ہمیں عطا کیا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قانون نہیں ہوگا تو فرقوں میں بٹی اس امت میں ختم نہ ہونے والا فساد شروع ہو جائے گا۔ اسی طرح ہم اس بات کے بھی خلاف نہیں کہ بین الاقوامی سطح پر اس طرح کے واقعات کی روک تھام کے لیے جو بھی کوشش کی جاسکتی ہو وہ کی جائے۔ حکمت و بصیرت کے ساتھ ایسا کرنا ہرگز غلط نہیں ہوگا۔

اب ہم بہت اختصار سے یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح کے کسی قانون کی رحمت للعالمین سے نسبت غلط ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضور نے پوری زندگی گھٹیا معاندین اور بدترین دشمنوں کا سامنا کیا۔ انھوں نے ہر قدم پر آپ کے دین کے ساتھ آپ کی شخصیت اور خاندان کو بھی ہدف

بنایا۔ اگر آپ ان کو سزا دینے والے ہوتے تو کفار مکہ اور یہود ومنافقین میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچتا۔ مگر سیرت طیبہ کی یہ روشن حقیقت ہے کہ آپ نے خدا کے حکم کے سوا کبھی کسی کو سزا نہیں دی۔ آپ کی یہی وہ اعلیٰ ظرفی تھی جس نے آپ کو دلوں کا بادشاہ بنا دیا تھا۔

دوسری چیز یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کسی ایسے قانون اور سزا سے خالی ہے جس میں کسی گستاخ رسول کی سزا کا کوئی ضابطہ بیان کیا گیا ہو۔ یہی معاملہ احادیث کا ہے۔ قتل، چوری، زنا وغیرہ کی طرح جن کے بارے میں قرآن کے ساتھ ذخیرہ حدیث بھی تفصیلات سے بھرا ہوا ہے گستاخی رسول کا کوئی قانون اور اس کی کسی سزا کے ذکر سے قرآن اور حدیث دونوں خالی ہیں۔

اب لے دے کے کچھ واقعات ہیں جو پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں جمع کر دیے ہیں۔ اس حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ اس طرح کے بیان کیے جانے والے واقعات کی ایک بڑی تعداد غیر ثابت شدہ ہے۔ مثلاً بہت مشہور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ نہ ماننے والے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ مگر ابن کثیر نے یہ واقعہ نقل کر کے بتا دیا ہے کہ یہ ثابت شدہ نہیں ہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن پر اپنے بعض پچھلے مضامین میں اس طالب علم نے بھی اور بعض دیگر اہل علم نے بھی واضح کیا ہے کہ وہ غیر مصدقہ ہیں۔

اب رہے ثابت شدہ واقعات جیسے کعب بن اشرف اور ابو رافع وغیرہ تو ان کا معاملہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر جو سزا نافذ کی گئی وہ اللہ کے رسول کا انکار کرنے اور اس کے لائے ہوئے دین کے خلاف عناد کا عملی اظہار کرنے کی سزا تھی۔ اس طرح کے معاندین اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف شب و روز سازشیں کرتے، کفار مکہ کو مدینہ پر حملہ کرنے پر اکساتے، مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے اور اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتے تھے۔ اس سارے عمل میں وہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اہل خانہ اور عام مسلمانوں کو ایذا بھی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جرم یہ تھا کہ یہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی دعوت کو مٹانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف یہ لوگ کفار کے ساتھ مل کر اسلام کو مٹانے کی سازشیں کر رہے تھے اور دوسری طرف مدینہ میں رہ کر الزام و بہتان لگانے، جھوٹا پروپیگنڈا کرنے، مسلم خواتین کو ایذا دینے اور بیہودہ گوئی کا راستہ اختیار کر چکے تھے۔ قرآن مجید کی سورہ احزاب میں ان کے اسی معاندانہ رویے کو موضوع بنا کر یہ بتا دیا گیا تھا کہ یہ باز نہ آئے تو آخر کار اپنے عناد کی سزا پا کر جلاوطن کر دیے جائیں گے یا مار دیے جائیں گے۔ یہ رسولوں کی اقوام کے بارے میں اللہ کی ایک غیر متبدل سنت ہے کہ رسولوں کے ایسے معاندین کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا، (الاحزاب 33:62)۔

چنانچہ یہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف دشمنی میں ہر حد پامال کرنے کی وہ سزا تھی جو اللہ کے حکم سے دی گئی اور اس قانون رسالت کے مطابق دی گئی جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا اور جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ رسول کے خلاف اٹھنے والے لوگوں کو اتمام حجت کے بعد یا تو فطرت کی طاقتوں کے ہاتھوں برباد کر دیا جاتا ہے یا پھر جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہوا کہ صحابہ کرام کی تلواروں کے ہاتھوں ان پر اللہ کا عذاب آیا، (التوبہ 9:14)۔

اس طرح کے لوگوں کی بیہودہ گوئی ان کے عناد کا ایک اظہار تو ضرور تھا، مگر یہ ان کے قتل کی اصل وجہ نہ تھی۔ حضور کی ہستی اس سے بہت بلند تھی کہ اپنی ذات کے لیے لوگوں سے انتقام لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں۔ آپ نے ساری زندگی گالیاں کھا کر دعائیں دی ہیں۔ بدترین قاتلوں اور دشمنوں کو معاف کیا ہے۔ ایسی پاکیزہ، بلند اور اعلیٰ ہستی کے بارے میں یہ تاثر دینا کہ وہ اپنی ذات کے لیے انتقام لیا کرتی تھی، پیغمبر اسلام سے محبت کا اچھا اظہار نہیں ہے۔

ایک مردِ باعمل

یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ کسی شاعر نے اس مضمون کو کتنی خوبی سے باندھا ہے:

کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے کسی کا کندا نگینے پہ نام ہوتا ہے

عجب سرا ہے یہ دنیا جہاں پہ صبح و مساء کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

ہم عام طور پر اس حقیقت کو بھولے رہتے ہیں۔ مگر جب کبھی کسی قریبی شخص کی اچانک وفات کا سانحہ پیش آتا ہے تو یہ احساس تازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے ناگہانی واقعات ہمیں جھنجھوڑ کر یہ بتاتے ہیں کہ یہ دنیا رہنے بسنے کا مقام نہیں، بس ایک سرائے ہے جہاں ازل کا مسافر ابد کی منزل کو جاتے ہوئے کچھ دن کے لیے ٹھہر گیا ہے۔ مگر آہ کہ ہر مسافر اس سرائے میں ایسے مگن ہو جاتا ہے کہ گویا اسے کبھی مرنا نہیں ہے۔ پھر ایک روز موت کا فرشتہ اپنا ہاتھ بڑھا کر کہتا ہے کہ عمل کی مہلت ختم ہوئی۔ آؤ اور میرے ساتھ انجام کی منزل کی طرف چل پڑو۔

ہمارے عزیز دوست ذوالفقار علی چوہان کی اچانک موت نے بھی اس احساس کو پوری طرح زندہ کر دیا ہے کہ مہلت عمل کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ انسان کو ہر رات کو آخری رات اور ہر دن کو آخری دن سمجھ کر اگلی دنیا کی تیاری کرتے ہوئے جینا چاہیے۔ ربع صدی کے عرصے تک پھیلے ہوئے تعلق میں اس طالب علم نے چوہان صاحب کو ایسا ہی انسان پایا۔

ایک ایسے دور میں جب مروجہ مذہبی فکر لوگوں کا اخلاق و کردار بدلنے کے بجائے ان کے ظاہر کو تبدیلی کی علامت بنا رہی ہے۔ خدا سے محبت اور اس کا خوف پیدا کرنے کے بجائے فرقہ واریت، تعصب، نفرت اور انتہا پسندی کا صور پھونک رہی ہے۔ اس دور میں اور اسی فکر میں پروان چڑھنے کے باوجود چوہان صاحب کی فطری پاکیزگی نے انھیں بالکل برعکس صفات کا حامل بنا دیا تھا۔ سادہ، مخلص، خدا کا خوف رکھنے والے، ہمدرد، خیر خواہ، نصرت دین کے لیے ہمہ

وقت تیار، داعیانہ تڑپ کے حامل اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے۔

ربع صدی کے اس تعلق میں مجھے بار بار ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا سامنا ہوا۔ ہمارا ابتدائی تعارف اس وقت ہوا جب ہم اپنے اپنے پس منظر میں حق کے متلاشی بن کر مختلف اہل علم سے استفادہ کررہے تھے۔ اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھ جانے کے بعد ہمارا سفر ایک ہی جیسے نتائج فکر پر ختم ہوا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کے اِس طالب نے ایمان واخلاق کے حق کی دریافت کے بعد اس کے ابلاغ کو کل وقتی طور پر اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنالیا۔ جبکہ چوہان صاحب نے جز وقتی طور پر اس مشن کو اپنی زندگی بنائے رکھا۔

ان کی فطرت صالحہ ایمان واخلاق کی قرآنی دعوت سے کس درجہ ہم آہنگ تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سن 2009 میں جب احباب کے اصرار پر میں نے زندگی کا واحد دورہ ترجمہ قرآن کرایا تو عید کے دن چوہان صاحب نے مجھے فون کرکے کہا کہ میں نے پچھلے بائیس سال میں ہر برس دورہ ترجمہ قرآن کے پروگرام اٹینڈ کیے اور ہر سطح کے عالم سے قرآن سنا ہے۔ لیکن قرآن جیسا اب سمجھا، پہلے کبھی نہیں سمجھا تھا۔ اس کا سبب اِس طالب علم کی کوئی خوبی نہیں بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اِس نے قرآن مجید کے اصل پیغام یعنی ایمان واخلاق کو نمایاں کرکے پیش کیا تھا۔

ایمان واخلاق کی یہ دعوت چوہان صاحب کی عملی زندگی بھی رہی۔ یہ ان کا اخلاق رہی۔ یہ ان کی دعوت رہی۔ ان کا انتقال اچانک ہوا لیکن اس سے ذرا دیر قبل تک وہ ہمارے وہاٹس ایپ گروپ اور فیس بک اکاؤنٹ پر دعوت دین کے جذبے سے سرشار ہوکر دعوتی مواد شیئر کررہے تھے۔ کیا ہی اعلیٰ عمل تھا جو ایک بندہ مومن زندگی کے آخری وقت تک اختیار کیے ہوئے تھا۔

دعوت دین کے لیے ان کی تڑپ کس درجہ میں تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے

کہ وہ ایک سے زیادہ دفعہ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ میں نے چند لاکھ روپے اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے بچا کر رکھے ہیں۔ پھر مجھے یہ پیشکش کی کہ میں یہ رقم دعوت دین کے کاموں میں استعمال کرلوں۔ میرے لیے ظاہر ہے کہ اس پیشکش کو قبول کرنا ممکن نہیں تھا۔ مگر اس سے ان کے جذبہ ایثار و قربانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جن لوگوں کا ان سے واسطہ پڑا وہ جانتے ہیں کہ چوہان صاحب ایک سادہ مزاج آدمی تھے۔ لوگوں کے ہمدرد، خیر خواہ اور دوسروں کے مسائل حل کرنے کی اپنی حد تک کوشش کرنے والے۔ میری ان سے آخری ملاقات ایک ماہ قبل اس وقت ہوئی جب وہ میری ایک تقریر سننے کے لیے آئے تھے۔ ان سے ملتے وقت معلوم نہ تھا کہ اس بندہ مومن سے یہ میری آخری ملاقات ہوگی۔ مگر اب خیال آتا ہے کہ اس مخلص داعی کی اچانک موت کو بھی اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت ہی کا ایک ذریعہ بنادیا ہے۔ دین کی دعوت کیا ہے؟ اس بات کی یاددہانی کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے جہاں موت ہر شخص کو آنی ہے۔ مگر لوگ اس موت کو بھولے رہتے ہیں۔ ایسے میں اچانک آنے والی موت ہم جیسے غافلوں کو جھنجھوڑنے کا ایک بڑا ذریعہ بن جاتی ہے۔ رہے چوہان صاحب تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال صالح کی بنا پر انھیں اس سرائے فانی کی سختیوں سے بچا کر اپنے قرب کی راحت اور فردوس کی ابدی بستی کے ایک مکین کے طور پر منتخب کرلیا ہوگا۔ کیا ہی خوب بدلہ ہے جو نیکوکاروں کے لیے ان کے مہربان رب نے تیار کر رکھا ہے۔

موت ہر شخص کو آنی ہے۔ بہترین شخص وہ ہے جس کی موت کے وقت قرآن کی ایمان و اخلاق کی تعلیم جس پر جنت کا وعدہ ہے، یہ گواہی دے کہ سرائے فانی کے اس مسافر نے زادِ راہ کے طور پر مجھے اپنائے رکھا تھا۔ چوہان صاحب کی زندگی گواہ ہے کہ وہ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔

زندہ اور مردہ قوم

پچھلے محرم کے موقع پر کراچی کے ایک معروف ذاکر کا ایک ویڈیو کلپ بہت مشہور ہوا جس میں انھوں نے یہ بتایا تھا کہ نیپال میں نوجوان یوم عاشور صبح کے وقت اپنے گھر سے جنگل میں نکل جاتے ہیں اور چھریوں سے ماتم کرتے ہوئے مرجاتے ہیں، ان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ پھر شام کو وہ اٹھ کر اپنے گھر زندہ ہوکر لوٹ آتے ہیں۔ اپنی اس بات کو انھوں نے مزید یہ کہہ کر موکد کیا تھا کہ جس کا دل چاہے جا کے دیکھ لے کہ وہ کیسے مرتے اور کیسے زندہ ہوجاتے ہیں۔

ایک لطیفہ ایک حقیقت

فیس بک اور سوشل میڈیا پر ایک عرصہ تک اس بات کا چرچا رہا اور یہ بات مذاق کا موضوع بن گئی۔ بہت سے لطائف تھے جو اس حوالے سے بنالیے گئے اور کافی مشہور ہوئے۔ ان میں سے ایک لطیفہ کچھ اس طرح بنایا گیا کہ صوبہ سندھ میں ہر روز سرکاری ملازم اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور سرکاری دفتروں میں جا کر مرجاتے ہیں، انھیں موت آجاتی ہے۔ پھر شام کے وقت وہ اٹھتے ہیں اور زندہ ہوکر گھر لوٹ جاتے ہیں۔ جس کا دل چاہے جا کے دیکھ لے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ لطیفہ ہے، مگر اپنی جگہ اس پہلو سے ایک حقیقت کا بڑا لطیف بیان ہے کہ ملک بھر کے سرکاری دفاتر میں بالعموم اور صوبہ سندھ کے سرکاری دفاتر میں یہاں کے مخصوص حالات کی بنا پر سرکاری ملازمت بغیر کام کیے تنخواہ لینے کا نام ہے۔ آپ کسی بھی سرکاری دفتر میں چلے جائیں، اکثر و بیشتر لوگ دفتر کے اوقات میں اپنی سیٹ پر نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں تو کام نہیں کرتے۔ صبح دیر سے آتے ہیں اور جلد چلے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ لنچ کے لیے آنے جانے کا ہے۔ وقت سے پہلے چلے جانا اور وقت کے بعد آنا معمول ہے۔

اس کے علاوہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عام لوگوں کو تنگ کرنے کے علاوہ ان سے رشوت لے کر یا سرکاری خزانے سے ناجائز طریقے پر لاکھوں کروڑوں روپے کمائے جاتے ہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ ان سرکاری دفاتر سے کوئی جائز کام بغیر رشوت کے نہیں کرایا جاسکتا ہے اور ہر ناجائز کام رشوت دے کر کرایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ذاتی تجربات، مشاہدات اور حقیقی واقعات کی ایک داستان ہے جو یہاں رہنے والے لوگ بیان کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ نے کوئی پراپرٹی بیچنی ہے تو اس کے لیے رجسٹرار آفس میں جا کر بیچنے والے اور خریدنے والوں کو رجسٹرار کے سامنے دستخط کرنے ہوتے ہیں۔ رجسٹرار کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ متعلقہ دستاویز، فیس چالان وغیرہ کو دیکھ کر یہ بات یقینی بنالے کہ لین دین باہمی رضامندی سے ہو رہا ہے اور یہ کہ حکومتی فیس ادا کر دی گئی ہے۔

ہر روز درجنوں بلکہ بعض اوقات سینکڑوں کی تعداد میں یہ سودے ہوتے ہیں اور ہر سودے میں لاکھوں روپے رشوت کے وصول کیے جاتے ہیں۔ چاہے کاغذات پورے ہوں۔ چاہے تمام فیس چالان بھر دیے گئے ہوں یہ پیسے ہر حال میں دینے ہوتے ہیں۔ اگر کچھ کاغذات کم ہیں تو اس کے اضافی پیسے لگتے ہیں۔ اگر آپ کی جیب میں پیسے ہوں تو ہر کام کرایا جاسکتا ہے۔ یہ سارا پیسہ اوپر تک تقسیم ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص اس سلسلے کو نہیں روکتا۔

ہمہ گیر بگاڑ

یہ معاملہ صرف ایسے ہی سرکاری دفاتر کا نہیں جہاں مالیاتی لین دین ہوتا ہے بلکہ بعض ایسے شعبے جہاں لوگ توقع نہیں کرسکتے وہاں بھی یہ کھیل عام ہے۔ مثال کے طور پر سرکاری ہسپتال میں کام کرنے والے ایک دیانت دار ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہسپتالوں کے کئی واقعات سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ سرکاری ہسپتالوں میں بعض بڑے سرجنوں اور ڈاکٹروں کا یہ طریقہ ہے کہ کوئی

مشکل کیس اگر آ جائے تو مریض کو خوفزدہ کر کے اسے آمادہ کر لیتے ہیں کہ وہ یہ آپریشن ان کے پرائیویٹ ہسپتال یا کلینک میں کروائے۔ اور یوں وہ پرائیویٹ علاج کے ذریعے سے مہینے کے لاکھوں روپے کما لیتے ہیں۔ یہ تو بڑے لوگوں کا حال ہے جبکہ چپڑاسی اور خاکروبوں کی سطح کے لوگوں کے اپنے ڈھنگ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ ان سے ایک دفعہ ایک مریض نے شکایت کی کہ خاکروب اس مریض کو پیشاب کا برتن بستر پر لا کر دینے کے دس روپے لیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاکروب کو خوب ڈانٹا۔ اس کے بعد اگلے دن وہ راؤنڈ پر گئے تو مریض نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اب وہ خاموشی سے دس روپے دے دیا کرے گا۔ مہربانی کر کے وہ خاکروب کو کچھ نہ کہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ اب تو وہ پیشاب کا برتن لا کر ہی نہیں دیتا اور وہ اذیت اٹھاتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے خاکروب کو بلا کر اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ کیا کرے، وارڈ میں ساٹھ مریض ہیں اور چھ برتن ہیں۔ ایسے میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ اس کے جواب میں وہ کیا کر سکتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے ایک اور واقعہ سنایا کہ ایک مریض نے ایک دفعہ طبی معائنے کے دوران میں ڈرتے ڈرتے یہ بتایا کہ ان کا چپڑاسی کوئی کیس ان تک پہنچانے کے پچاس روپے لیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا تو اس میں دس روپے کا حصہ ہے باقی ڈاکٹر صاحب کے پیسے ہیں۔ انھوں نے اس کے خلاف کارروائی کرنی چاہی تو باقی ڈاکٹروں نے انھیں منع کیا کہ کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے کہیں نہیں جانا کیونکہ اسے عذیر بلوچ نے رکھوایا ہے۔ باقی یہاں اوپر سے نیچے تک سب ملے ہوتے ہیں۔ کسی کا کچھ نہیں ہونا۔

یہ وہ صورتحال ہے جس میں ہمارے ہاں حکمرانوں کی کرپشن کا رونا رویا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری حکمران کلاس ہی نہیں بلکہ پورے حکومتی انتظامی ڈھانچے کو کرپشن کی

دیمک کھا چکی ہے۔ پھر معاملہ یوں نہیں کہ باقی معاشرے میں ہر جگہ لوگ آب زم زم سے دھلے ہوئے ہیں۔ اخلاقی طور پر ہمارا پورا معاشرہ گل سڑ چکا ہے۔

ہماری صورتحال یہ ہے کہ ناجائز منافع خوری کو تو ایک طرف رکھیے، حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں نہ دوا خالص ملتی ہے نہ غذا ملاوٹ سے پاک ہے۔ نہ گاڑیوں کو چلانے والا پٹرول پورا اور خالص ملتا ہے نہ بچوں اور بڑوں کی غذا یعنی دودھ خالص ملتا ہے۔ غرض کس کس چیز کا رونا رویا جائے۔ مگر بات اگر معاشی معاملات تک محدود ہوتی تو پھر غنیمت تھا۔ ہمارے ہاں ہر ہر دائرے اور ہر ہر رشتے میں اخلاقی انحطاط پھیل چکا ہے۔ دفاتر ہی نہیں گھر، خاندان، تعلیمی ادارے سب اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔ تربیت کے ادارے تباہ ہو چکے ہیں یا پھر غلط رہنمائی کر رہے ہیں۔ ایسے میں کیا امید کی جائے اور کس سے امید کی جائے۔ لگتا ہے کہ ہر طرف اندھیرا چھا رہا ہے اور یہ اندھیرا گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔

قرآن کی روشنی

اس صورتحال میں امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے تو وہ کتاب اللہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس عظیم کلام کو اللہ تعالیٰ نے خود ایک نور قرار دیا ہے، (المائدہ 15:5)۔ قرآن مجید کی سورہ بقرہ آیت 259 میں اللہ تعالیٰ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے ایک نبی کا ہے جن کا نام تو نہیں لیا گیا، مگر جو واقعہ ان کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے، اس سے ملتا جلتا واقعہ قدیم صحف سماوی میں سے صرف حزقی ایل نبی کی کتاب میں موجود ہے۔ جن حالات اور جس کام کے پس منظر میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ بھی وہی ہیں جن کا سامنا حزقی ایل نبی کو تھا۔

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے زمانے میں بنی اسرائیل اپنی طاقت اور عظمت کے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ حضرت سلیمان نے ہیکل سلیمانی کی عظیم عبادت

گاہ بھی تعمیر کی تھی جو یہود کے نزدیک وہی حیثیت رکھتی تھی جو مسلمانوں کے ہاں حرم پاک کی ہے۔مگران کے بعد رفتہ رفتہ بنی اسرائیل اخلاقی زوال کا شکار ہوتے چلے گئے۔صورتحال یہ ہوگئی کہ بنی اسرائیل اپنے ان نبیوں کے دشمن ہوگئے جو انھیں سمجھانے کے لیے اٹھائے گئے تھے۔حضرت یرمیاہ جیسے جلیل القدر نبی کو پہلے کنویں میں الٹا لٹکایا گیا اور پھر جیل خانے میں قید کردیا گیا۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قہر بھڑک اٹھا۔آشوری حکمران بخت نصر نے 587 قبل مسیح میں یروشلم پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ہیکل سلیمانی کو مکمل طور پر تباہ کردیا گیا۔لاکھوں یہودیوں کو قتل کیا گیا۔ان گنت خواتین کی آبروریزی کی گئی۔اچھی طرح خونریزی کرنے اور یروشلم کو تباہ و برباد کرنے کے بعد بخت نصر باقی یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا۔

بنی اسرائیل کے اس دورِ اسیری کے پانچویں برس اللہ تعالیٰ نے حضرت حزقی ایل کو نبی بنا کر اٹھایا اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا۔یہ وہ دور تھا جب بنی اسرائیل پوری طرح مایوسی کا شکار تھے۔ان کے لیے ہر امید اور ہر امکان ختم ہو چکا تھا۔خود حضرت حزقی ایل کو بھی اس کی امید نہ تھی کہ کبھی بنی اسرائیل اس صورتحال سے نکل سکیں گے اور یروشلم دوبارہ آباد ہوسکے گا۔

چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں حضرت حزقی ایل کو وہ مشاہدہ کرایا گیا جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ بقرہ آیت 259 میں کیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''یا اس شخص کی مثال ہے جس کا گذر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گر پڑی تھی۔اس نے حیرت سے کہا: اس طرح فنا ہوجانے کے بعد اللہ اسے کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا۔اس پر اسے اللہ نے سو سال کے لیے موت دی، پھر اٹھایا۔(وہ اٹھا تو) پوچھا: کتنی مدت پڑے رہے؟ اس نے جواب دیا: ایک دن یا اس سے کم۔فرمایا: نہیں بلکہ سو سال اسی حالت میں تم پر گزر گئے۔اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو، ان میں سے کوئی چیز سڑی

نہیں۔(دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (کہ ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں، اس لیے کہ تمھیں اس بستی کے اٹھائے جانے پر یقین ہو) اور اس لیے کہ ہم لوگوں کے لیے تمھیں (امید کی) ایک نشانی بنا دیں، اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، ہم کس طرح ان کو اٹھاتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت اس پر واضح ہو گئی تو وہ پکار اٹھا کہ (اب کوئی تردد نہیں رہا)، میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس مشاہدے نے نبی کے دل کو امید اور یقین سے بھر دیا۔ انھوں نے اپنی قوم میں توبہ کی وہ منادی کی جس نے پورے بنی اسرائیل کو ہلا کر رکھ دیا۔ قوم نے اپنے گناہوں سے توبہ کی جن کی بنا پر وہ اس حال کو پہنچے تھے۔ اس کے بعد اللہ کا فضل ہوا۔ ایران کے بادشاہ سائرس اعظم یا خورس اعظم جنھیں قرآن مجید ذوالقرنین کہتا ہے، انھوں نے عراق کے آشوری حکمرانوں کو شکست دی۔ وہ ایک نیک دل بادشاہ تھے۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو عراقیوں کی قید سے رہائی دلوائی اور یروشلم جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے دوبارہ یروشلم کو آباد کر دیا۔

ہمارے لیے کرنے کا کام

پیغمبروں کی تاریخ کا یہ واقعہ اپنے اندر ایک بھرپور سبق رکھتا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ قوم کی لیڈر شپ کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی قوم میں ایمان اور اخلاق کی دعوت کا صور پھونکتے رہنا چاہیے۔ جب قوم کا ایک قابل قدر طبقہ اس دعوت کو قبول کر لیتا ہے تو پھر اللہ کی مدد آتی ہے۔ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر کسی مسلم قوم کے لیے تبدیلی کا نقطہ آغاز کوئی سیاسی اچھل کود یا کوئی سماجی تحریک اور معاشی تحریک نہیں بلکہ ایمان واخلاق کا وہ پیغام ہے جو قرآن مجید کی دعوت ہے۔ اس دعوت پر آخرت میں فرد کی نجات موقوف ہے اور اسی دعوت پر دنیا میں قوم کی فلاح پوشیدہ ہے۔

لیکن یہ کام ایک طویل اور خاموش جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا نشانہ فرد ہوتا ہے۔ اس کا ہدف لوگوں کی سوچ کو بدلنا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو ان کے اندھے تعصّبات سے اوپر اٹھانا ہوتا ہے۔ ان کی خواہشات اور مفاد سے انھیں بالاتر کرنا ہوتا ہے۔ انھیں انانیت اور نفسانیت کے بجائے بندگی، اخلاص اور اخلاق عالیہ کے راستے پر ڈالنا ہوتا ہے۔ خدا کی ذات کو ان کے لیے سب سے اہم بنانا ہوتا ہے۔ آخرت کی پیشی کو ان کا سب سے بڑا مسئلہ بنانا ہوتا ہے۔ رسول کی اتباع کو ہر دوسری پیروی سے اہم تر کرنا ہوتا ہے۔ خدا کے کلام کو ہر دوسرے کلام کے مقابلے میں سب سے برتر بنانا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تعصّبات، خواہشات، مفادات اور انانیت میں جکڑے لوگوں کو یہ بات سمجھانا آسان نہیں۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ موجود ہی نہیں ہے۔ جو خیر نکلے گا وہ اسی راہ پر چلنے سے نکلے گا۔ دوسرا ہر راستہ تباہی کو بڑھانے والا ہی ثابت ہوگا جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا ایمان و اخلاق کی اسی دعوت کا راستہ ہم نے اپنے لیے چنا ہے اور اسی کی طرف ہم دوسروں کو بلا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو زیادہ دن نہیں گزریں گے اور ہماری قوم ایک بہتر وقت دیکھے گی۔

جہاں رہیں مخلوق خدا کے لیے باعثِ رحمت بن کر رہیں، باعثِ آزار نہ بنیں۔

زندگی	میں	پیش	آنے	والے	ناگوار حالات
روزے	دار کے	ایک	سخت	دن	کی طرح
آخر	کار	گزر	جاتے	ہیں	(ابویحییٰ)

ڈاکٹر شہزاد سلیم/محمود مرزا

کامیاب زندگی کا ایک راز

زندگی میں کامیابی کا انحصار جیسے دیگر اہم عوامل پر ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے گردو پیش میں موجود لوگوں کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔ چاہے وہ ہمارے اعزہ و اقربا ہوں، دوست احباب ہوں یا پھر ہمارے ساتھ کام کرنے والے لوگ۔

ان سب کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر انداز میں قائم رکھنے کا ایک ہی راز ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ان کی پرسنیلٹی ٹائپ کو سمجھیں، اس کا مطالعہ کریں اور پھر جیسی ان کی شخصیت ہے ان کو اس کے ساتھ قبول کریں اور ان کا احترام کریں۔

اس ضمن میں کرنے کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم اپنے گردو پیش میں موجود قریبی لوگوں کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیں اور پھر بجائے اس کے کہ ہم ان کی خامیوں کی فہرست بنا کر اس پر تبصرہ کریں، ہمیں چاہیے کہ ان کی خامیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ کیسے ان کی خوبیوں کو نمایاں کیا جائے اور کس طرح ان کی خامیوں کے باعث پیدا ہونے والے خلا کو پر کیا جائے۔

البتہ یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک شخصیت کے اس جائزہ کا عمل ہم اپنی ذات سے شروع نہ کریں جس سے متعلق ہمارے پاس اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت مکمل ڈیٹا میسر ہوتا ہے۔ یہی وہ خود احتسابی کا عمل ہے جس کی مدد سے ہم مکمل طور پر اپنی تمام اچھائیوں اور کمزوریوں سے آگاہ ہوجاتے ہیں، اور اپنے فکر و عمل میں بہتری لانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

جاوید چوہدری

بے ایمان پارسا قوم

عمرے کا سیزن یکم محرم کو شروع ہوتا ہے، رمضان کی 25 تاریخ تک عمرے کے ویزے جاری ہوتے ہیں اور 15 شوال کو مکمل طور پر بند کر دیے جاتے ہیں یوں عمرے کا سیزن تقریباً نو ماہ جاری رہتا ہے، اس سال بھی یکم محرم (12 ستمبر) کو عمرے کا سیزن شروع ہوا اور اتوار 28 اکتوبر 2018ء (18 صفر المظفر) کو اس سیزن کو ایک ماہ اور 17 دن ہو گئے، سعودی حکومت نے ان 47 دنوں میں ساڑھے چھ لاکھ عمرہ ویزے جاری کیے، آپ شاید یہ جان کر حیران ہوں گے پوری دنیا میں عمرے کے سب سے زیادہ ویزے پاکستانیوں نے حاصل کیے۔

پاکستانیوں نے 47 دنوں میں ایک لاکھ 70 ہزار 8 سو 24 ویزے لیے، بھارت کا نمبر دوسرا تھا، انڈیا میں 19 کروڑ مسلمان ہیں، ان کے لیے 95 ہزار 7 سو 49 ویزے جاری ہوئے جب کہ ترکی نے سب سے کم 4 ہزار 6 سو 52 عمرہ ویزے لیے، یہ 47 دنوں کی صورت حال تھی، آپ اگر گزشتہ سال کے اعداد و شمار بھی دیکھیں تو آپ مزید حیران ہو جائیں گے، 2017ء میں پاکستان کے ایک لاکھ 79 ہزار 210 شہریوں نے حج اور 13 لاکھ لوگوں نے عمرے کی سعادت حاصل کی۔

ہم اگر عمرہ اور حج دونوں کو ملا لیں تو یہ کل پونے پندرہ لاکھ لوگ بنتے ہیں اور یہ دنیا میں حج اور عمرے کی سب سے بڑی تعداد ہے، انڈونیشیا ہمارے بعد آتا ہے، 2017ء میں 8 لاکھ 75 ہزار 958 انڈونیشین مسلمانوں نے عمرے اور حج ادا فرمائے جب کہ انڈیا کے 5 لاکھ 24 ہزار 609 لوگوں نے یہ سعادت حاصل کی، پاکستان گزشتہ کئی برسوں سے حج میں دوسرے نمبر پر آ رہا ہے، 2016ء میں بھی ہم دوسرے نمبر پر تھے، ہم نے ایک لاکھ 43 ہزار 368 لوگوں کے لیے حج کے ویزے حاصل کیے تھے جب کہ انڈونیشیا ڈیڑھ لاکھ حجاج کرام کے ساتھ پہلے نمبر پر تھا، یہ ایک صورتحال ہے، آپ اب دوسری صورت حال بھی ملاحظہ کیجیے۔

پاکستان بے ایمانی (کرپشن) میں 180 ممالک میں 117 نمبر پر آتا ہے، دنیا میں نیوزی لینڈ، ڈنمارک، فن لینڈ، ناروے، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، سویڈن، کینیڈا، لکسمبرگ، نیدرلینڈ اور برطانیہ ایمانداری میں پہلے دس نمبروں میں آتے ہیں جب کہ ٹوگو، آذربائیجان، جبوتی، قازقستان، لائبیریا، ملاوی، مالی، نیپال، مالدوا، گیمبیا، میانمار، سیرالیون، ہنڈوراس، لاؤس اور پاپوا نیوگنی ہم سے زیادہ بے ایمان ہیں، ہم جہالت میں بھی 197 ملکوں میں 143 نمبر پر ہیں، ہم تعلیم میں یونیسکو کے 120 رکن ملکوں میں 113 نمبر پر آتے ہیں، سری لنکا اور فلپائن جیسے غریب ملک بھی تعلیم میں ہم سے آگے ہیں، سری لنکا میں 92 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں اور یہ تعلیم یافتہ ملکوں میں نمبر 83 پر ہے جب کہ ہمارے اڑھائی کروڑ بچے آج بھی اسکول کی نعمت سے محروم ہیں، پاکستان کی 80 فیصد آبادی کو پینے کا صاف پانی بھی نہیں ملتا۔ عالمی ادارہ صحت نے 2016ء میں 184 ممالک میں پاکستان کو فضائی آلودگی میں چوتھا بدترین ملک قرار دیا تھا گویا 180 ملکوں کی فضا ہم سے صاف قرار دی گئی۔

پاکستان نائیجیریا اور افغانستان کے ساتھ ان تین ملکوں میں بھی شامل ہے جہاں پولیو ابھی تک موجود ہے، ہمارا ملک ہیپاٹائٹس سی میں دنیا میں دوسرے، ٹی بی میں پانچویں، شوگر میں ساتویں اور گردے کے امراض میں آٹھویں نمبر پر ہے، ہمارے ملک میں ہر سال تین لاکھ لوگ دل کی بیماریوں کی وجہ سے انتقال کر جاتے ہیں، ہم دماغی امراض اور کینسر میں بھی خطرے کی لکیر پر کھڑے ہیں، ہم روڈ ایکسیڈنٹس میں بھی ٹاپ پر آتے ہیں اور ہم قتل، ڈکیتیوں، زنا بالجبر، لڑائی جھگڑوں، گندگی، آلودہ پانی، اغواء برائے تاوان، بچوں اور خواتین کو ہراساں کرنے اور ناانصافی کے شکار ملکوں میں بھی سر فہرست ہیں، ہمارے ملک کی 52 فیصد آبادی بلڈ پریشر کی شکار ہے، ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جہاں صدر اور وزیراعظم کو بھی خالص دودھ، خالص آٹا، خالص گوشت اور خالص دوائیں دستیاب نہیں ہیں، جس میں نمازی بھی گندے پانی سے وضو کرتے ہیں اور اسپتال میں بھی خالص آکسیجن نہیں ملتی، ہم پانی کی انتہائی کمی کے شکار پہلے تین

ملکوں میں بھی شمار ہوتے ہیں، اسپتالوں میں مریضوں کے گردے چوری ہو جاتے ہیں، سرجن دل کے مریضوں کو جعلی اسٹنٹ لگا دیتے ہیں، ہم جعلی دواؤں میں بھی دنیا میں نمبر 13 پر ہیں، جنوری 2012ء میں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں 100 سے زائد مریض غلط دوا کھانے سے مر گئے تھے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کے اسپتالوں میں چوہے نومولود بچوں کو کھا جاتے ہیں۔گلوبل ہنگر انڈیکس کے مطابق ملک کی 32.6 فیصد آبادی خوراک کی کمی کا شکار ہے۔وزیراعظم عمران خان کے مطابق 10 بلین ڈالر ملک سے سالانہ منی لانڈر ہو جاتے ہیں اور نیب کے اپنے اعداد وشمار کے مطابق ملک میں روزانہ چھ سے سات ارب روپے کرپشن کی نذر ہوتے ہیں۔

آپ اگر ان اعداد وشمار کو ایک سائیڈ پر رکھ دیں اور خود تحقیق کر لیں تو بھی ثابت ہو گا ہمارے ملک میں چپڑاسی سے لے کر ایوان صدر تک پورا سسٹم کرپشن میں لتھڑا ہوا ہے، پولیس رشوت کے بغیر ایف آئی آر نہیں لکھتی، ایف آئی آر ہو جائے تو یہ رقم کے بغیر ملزم گرفتار نہیں کرتی اور یہ اگر ملزم گرفتار بھی کر لے تو بھی یہ دوسری پارٹی سے پیسے لے کر ملزم کو بے گناہ قرار دے دیتی ہے، محکمہ مال پورے کا پورا کرپٹ ہے، وزیراعظم عمران خان کو بھی رشوت اور سفارش کے بغیر کوئی فرد نہیں ملے گا۔نیب کی حالت پوری دنیا کے سامنے ہے، نظام عدل کے بارے میں چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس ثاقب نثار کے اپنے تبصرے کافی ہیں۔ ہمارے ملک میں مسجدوں تک سے جوتے، پنکھے، ٹونٹیاں اور قالین چوری ہو جاتے ہیں۔

لوگ داڑھی رکھ کر مسجد کا چندہ، یتیموں کا مال اور بیواؤں کی کمائی کھا جاتے ہیں۔ پولیس نے فروری 2017ء میں راولپنڈی سے اشرف نام کا ایک مجرم پکڑا تھا، یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد ظالم انسان تھا، یہ مختلف علاقوں میں خواتین سے شادی کرتا تھا، بچہ یا بچی پیدا کرتا تھا، یہ بچی یا بچہ بیچ دیتا تھا اور بیوی کو طلاق دے کر غائب ہو جاتا تھا، وہ پکڑے جانے تک آدھ درجن بچے بیچ چکا تھا۔ پاکستان میں اس وقت 80 لاکھ نشئی ہیں، ہم دنیا میں نشئیوں میں بھی اولین نمبروں پر آتے

ہیں۔ آپ بازاروں اور محلوں میں بھی دیکھ لیں، آپ عموماً حاجی حضرات سے لٹیں گے، لوگ داڑھی رکھ کر آئیں گے، آپ ان کی پارسائی سے متاثر ہوں گے اور وہ آخر میں آپ کو لوٹ لیں گے، آپ کو لاکھوں لوگ پیروں، مبلغوں اور مذہبی رہنماؤں کے ہاتھوں بھی لٹتے ملیں گے، 2013ء میں مضاربہ سکینڈل آیا تھا، اس میں مفتی حضرات 9584 لوگوں کو لوٹ کر فرار ہو گئے، یہ ساڑھے چھ ارب روپے کا سکینڈل تھا، ڈبل شاہ خود کو سید زادہ کہتا تھا، وہ سید بن کر 2158 لوگوں کو لوٹ کر کھا گیا۔

آپ اب تک جانوروں کی آنتوں اور چربی سے گھی، لکڑی کے برادے سے مرچیں، کالے چنے سے کالی مرچ اور عام بادام کو تیزاب میں بھگو کر کاغذی بنانے کی درجنوں کہانیاں سن چکے ہوں گے، آپ کو گندے نالے میں سبزی دھونے، کیپسول میں آٹا ڈال کر بیچنے اور ڈٹرجنٹ پاؤڈر سے دودھ بنانے کے واقعات بھی ازبر ہو چکے ہوں گے، میں نوجوان صحافی اقرارالحسن اور فوڈ ایکسپرٹ محسن بھٹی کو داد دیتا ہوں، ان دونوں نے پورے ملک کی آنکھیں کھول دیں، آپ نیک لوگوں کے اس ملک میں منرل واٹر خریدیں وہ جعلی نکلے گا، ادویات لیں وہ غیر معیاری ہوں گی، آپ اسپتال چلے جائیں ڈاکٹر کھانسی کو ٹی بی بنا کر آپ کا پیٹ کھول دیں گے، گھی خریدیں وہ چربی نکلے گا۔

دالیں، سبزی، گوشت اور آٹا چاول لیں وہ غیر معیاری اور دو نمبر ہوں گے، آپ بچے کو اسکول داخل کرا دیں فیس پچاس ہزار ہو گی لیکن بچہ سارا دن کھیل کود کر واپس آ جائے گا اور آپ مسجد جائیں گے تو جوتا، پرس اور موبائل گنوا بیٹھیں گے۔ آپ خود سوچیے جس ملک میں جنازے کے دوران لوگوں کی جیبیں کٹ جائیں اور جس میں حکومت کے پاس مینڈیٹ جعلی ہو اور پائلٹوں، وکیلوں، ڈاکٹروں، ججوں اور ارکان پارلیمنٹیرین کی ڈگریاں نقلی ہوں اس میں باقی کیا بچ جاتا ہے؟

میں جب بھی ججوں اور عمروں کی تعداد دیکھتا ہوں اور پھر دوسری طرف قوم کی حالت دیکھتا

ہوں تو میں کنفیوز ہو جاتا ہوں، مجھے سمجھ نہیں آتی میں اپنی قوم کو پرہیزگار سمجھوں یا پھر بے ایمان، آپ ایک طرف پارسائی ملاحظہ کیجیے خانہ کعبہ کے ہر طواف اور مسجد نبوی کی ہر نماز میں پاکستانی ضرور ہوتے ہیں، ہماری آدھی سے زائد آبادی باریش ہے، ہم گرین بیلٹس، پارکس اور راستوں میں بھی مسجدیں بنا لیتے ہیں، نمازی سڑک تک صفیں بچھا لیتے ہیں، اذان کی آوازیں دس دس منٹ تک آتی رہتی ہیں، ہم گھنٹہ گھنٹہ خطبے سنتے اور سناتے ہیں، ہماری تدفین کی رسومات بھی چالیس چالیس دن چلتی ہیں، ہمارے ملک میں دس محرم اور بارہ ربیع الاول کو قومی تعطیل ہوتی ہے اور پورے پورے شہر فوج کے کنٹرول میں چلے جاتے ہیں۔

مسجد مانسہرہ میں بنتی ہے لیکن چندہ کراچی میں مانگا جاتا ہے مگر دوسری طرف ہم دنیا کی بے ایمان ترین قوموں میں بھی شمار ہوتے ہیں، پاکستان میں کوئی ایک پراڈکٹ، کوئی ایک ادارہ اور کوئی ایک ایسا شخص نہیں ہم جس کی ایمانداری، اخلاص اور خالص ہونے کی قسم کھا سکیں، ہم حلف نامے بھی جھوٹے جمع کراتے ہیں اور عدالتوں میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ چنانچہ ہم اصل میں ہیں کیا؟ ہم پارسا ہیں یا بے ایمان، میں اکثر کنفیوز ہو جاتا ہوں، میرے دوست اینکر پرسن رحمان اظہر نے ایک دن پنجابی فلم کالا چور کا ایک ڈائیلاگ سنایا تھا۔

فلم میں سلطان راہی جج کو کہتا ہے ظلم ہوئے 24 گھنٹے تے عدالت لگے صرف آٹھ گھنٹے، اے کیسا انصاف ہے جج صاحب،، ہم بھی من حیث القوم ایسے ہی کالے چور ہیں، ہم لوگوں کی انتڑیوں میں ہیروئن بھر کر پیسہ کماتے ہیں اور اس پیسے سے عمرے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں، ہم عمرے اور حج میں پہلے نمبر پر ہیں اور ایمانداری میں 117 نمبر پر، واہ ہم بھی کیا لوگ ہیں، حج اور عمرے بھی جاری ہیں اور بے ایمانی کا تنور بھی خوب گرم ہے، پاکستان زندہ باد۔

[**بشکریہ روزنامہ ایکسپریس**]

یاسر پیرزادہ

نوجوانوں کے لیے پانچ مشورے

ڈاکٹر عادل نجم بھلے آدمی ہیں، ہمارے لڑکپن میں پی ٹی وی پر میزبانی کیا کرتے تھے، پھر ایک طویل عرصے کے لیے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے، کئی برس بعد ایک دن اچانک پتہ چلا کہ لمز کے وی سی چُن لیے گئے ہیں۔ وہاں سے فراغت کے بعد ملک سے باہر چلے گئے۔ آج کل بوسٹن میں رہتے ہیں، تدریس و تحقیق سے وابستہ ہیں، ماحولیاتی آلودگی سے بھی خاص دلچسپی ہے۔ آئے روز اس سے متعلق بین الاقوامی کانفرنسیں بھگتاتے رہتے ہیں اور ٹویٹر پر اپنی تصویریں اپ لوڈ کر کے ہم ایسوں کا دل جلاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پاکستانی نوجوانوں کے بارے میں بیک وقت پُر امید اور فکر مند رہتے ہیں، حال ہی میں انہوں نے یو این ڈی پی کے تعاون سے ایک رپورٹ مرتب کی ہے جو خاصے کی چیز ہے، رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں اس وقت 64% آبادی 30 سال سے کم عمر ہے جن میں سے 29% ایسے ہیں جن کی عمر 15 سے 29 سال کے درمیان ہے، ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے چشم کشا اعداد و شمار اکٹھے کیے ہیں جنہیں بیان کرنا یہاں ممکن نہیں، اس کے لیے آپ کو ویب سائٹ پر رپورٹ کا حقائق نامہ (Fact Sheet) پڑھنا پڑے گا، مختصر بات یہ ہے کہ اگلی تین دہائیوں تک یہ نوجوان پاکستان کے مستقبل کا تعین کریں گے۔ عادل نجم کی رپورٹ پڑھ کر رجائیت کا احساس ہوتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب نے اِن نوجوانوں سے کچھ زیادہ ہی امیدیں وابستہ کر لی ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب پُر امید ضرور ہیں مگر خوش فہم نہیں۔ اِس رپورٹ کو مرتب کرنے کے دوران ڈاکٹر صاحب ملک کے طول و عرض میں گھومے اور ہر خطے اور ہر طبقے کے نوجوان سے باتیں کیں، ایک دلچسپ بات انہوں نے بتائی کہ نوجوانوں کے جس گروپ میں بھی انہوں نے سوال پوچھا کہ آپ کی زندہ آئیڈیل شخصیت کون

ہے تو نوجوانوں کے پاس اپنے باپ کے علاوہ بتانے کے لیے کوئی نام ہی نہیں تھا۔ گویا ہم نے اپنے معاشرے میں جو کالک ملی ہے اُس کے نتیجے میں ہر نیک نام شخص کو قابل نفرت بنا دیا ہے، اب ہمارے نوجوانوں کے پاس کوئی رول ماڈل ہی نہیں جس کی وہ تقلید کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب جتنا پُر امید بھی نہیں رہا۔ ہم ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جہاں 15 سال کی عمر تک جب بچہ میٹرک کرتا ہے تو معاشرتی علوم کی کتابوں کو رٹہ لگا کر دنیا کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر اپنا چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس کی ذہن سازی یوں ہوتی ہے کہ ......ہم ایک عظیم قوم ہیں...... عالمی طاقتوں کو ہمارا وجود کھٹکتا ہے......کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف دیکھا تو ہم سر کاٹ دیں گے (حقیقت میں ساتویں آٹھویں کے بچے سر کاٹنے والی اصطلاحات بے دریغ استعمال کرتے ہیں) گویا جو نسل ہم تیار کر چکے ہیں وہ نفرت کے بیانیے کے زیر اثر پروان چڑھی ہے، ان بچوں کا تنقیدی شعور نہ ہونے کے برابر ہے اور اِن کے ذہنوں میں ایک ایسی دنیا کا تصور ہے جو اُن کے عظیم الشان ماضی سے حسد کرتے ہوئے اُن کے ساتھ ناانصافی کرتی ہے۔ یہ وہ نسل ہے جس کے ہاتھ میں پاکستان کے اگلے تیس برس ہوں گے۔ اِس نسل کے نوجوانوں کے لیے آج پانچ مفت مشورے پیش خدمت ہیں:

پہلا مشورہ یہ ہے کہ جو کچھ آپ کو اسکول میں پڑھایا گیا ہے اسے فراموش کر دیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جمع تفریق کرنا بھول جائیں یا انگریزی گرامر یا صرف و نحو بھلا دیں (ایسا میٹرک پاس نوجوان جو صرف و نحو کا مطلب جانتا ہو مجھ سے ہزار روپے انعام لے سکتا ہے)، مراد یہ ہے کہ اسکول میں تاریخ اور معاشرتی علوم کے نام پر آپ کو جو رٹایا گیا ہے اسے بھول کر کسی غیر ملکی طالب علم کی طرح اپنی تاریخ کو بغیر کوئی رعایت دیئے ذہن میں وہ تمام سوالات جمع کریں جن کا جواب نصابی کتابوں میں نہیں اور پھر ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یقیناً یہ ایک مشکل کام ہوگا مگر اِس کا آسان حل یہ ہے کہ ہر قسم کی کتابیں پڑھیں، ہر قسم کا نقطہ نظر جاننے

کی کوشش کریں۔ سوچیں کہ دنیا ہماری طرح کیوں نہیں سوچتی، ہر وہ سوال اٹھائیں جو اسکول میں ذہن میں آتا تھا مگر شرمندگی کی وجہ سے نہ پوچھ پائے، اگر کتابیں پڑھنا مشکل لگے تو اخبارات پڑھیں، اداریئے پڑھیں، ایک آدھ انگریزی جریدے پر نظر دوڑا لیں، کچھ نہ کچھ ایسا ضرور پڑھیں جو اسکول میں نہیں پڑھایا گیا۔ جب آپ پڑھنے کی عادت اپنا لیں گے تو پھر سوال اٹھے گا کہ کون سی کتاب حقائق پر مبنی ہے، کس کا نقطہ نظر صحیح ہے اور کس تاریخ دان کی بات حقیقت کے قریب ہے، یہ مرحلہ تنقیدی فکر اپنانے کا ہوگا اور یہی دوسرا مشورہ ہے۔ تنقیدی فکر کی کوئی تربیت ہمیں نہیں دی جاتی، ہمیں علم ہی نہیں کہ یہ کس چڑیا کا نام ہے، اسکولوں کی بات چھوڑیں یہاں تو بڑے بڑے پی ایچ ڈی صاحبان اِس سے محروم ہیں۔ تنقیدی فکر دراصل سوچ کے اس طریقہ کار کو کہتے ہیں جس کے تحت آپ اپنے تعصّبات کو پرے پھینک کر فقط حقائق کی چھانٹی کر کے سچ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ دوسروں کی جگہ خود کو رکھ کر سوچیں، یعنی اگر آپ پنجابی ہیں تو سندھی بن کر سوچیں، اگر سندھی ہیں تو پنجابی بن کر سوچیں، اگر مرد ہیں تو عورت بن کر سوچیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام بُت توڑ کر سوچیں، یعنی ذہن میں پہلے سے بٹھائی گئی باتوں کی پروا کیئے بغیر سوچیں اور بے رحم ہو کر صرف حقائق تلاش کریں چاہے اُس کی زد میں آپ کے اپنائے ہوئے رومانوی نظریات ہی کیوں نہ آ جائیں۔ جس دن آپ یہ کام سیکھ لیں گے، آپ پر حیرت انگیز انکشافات ہوں گے، آزمائش شرط ہے۔

تیسرا مشورہ یہ ہے کہ اپنا world view درست کریں۔ ساری دنیا ہماری دشمن نہیں اور ہم کوئی ایسے اہم بھی نہیں کہ دنیا کی طاقتیں ہمارے خلاف متحد ہو جائیں، اِس زمین پر صرف ہمارا ہی ماضی شاندار نہیں رہا بلکہ یورپ اور ایشیا کے دیگر ممالک کے پاس بھی عالیشان تاریخ ہے۔

لہٰذا اِس فریب سے نکلیں کہ امریکہ اور یورپ کی ترقی ہماری مرہون منت ہے، اور اگر ایسا ہے بھی تو آج اپنی ذلت و ناکامی کے ذمہ دار ہم خود ہیں نہ کہ کوئی صیہونی سازش! کیا یہ امریکہ اور

یورپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ابن سینا، فارابی اور جابر بن حیان کے علم سے استفادہ کرنے کی رائلٹی ہمیں ادا کرے؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں دنیا سے متعلق اپنے نفرت بھرے بیانیے کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔

چوتھا مشورہ اِس ساری بحث سے ہٹ کر ہے کہ نوجوان اپنے اندر کوئی ایسا ہنر پیدا کریں جس کی معاشرے میں مانگ ہو مگر ہنرمند افراد کم ہوں۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں پیرامیڈک سٹاف کم ہے اِس کے باوجود کتنے لڑکے ایسے ہیں جن کی زبانی آپ نے یہ سنا ہو کہ وہ میل نرس بننا چاہتے ہیں جبکہ اِس کی نوکری بھی آسانی سے مل جاتی ہے؟ اسی طرح آج کل ہر کم تعلیم یافتہ شخص ڈرائیور بن جاتا ہے کیونکہ یہ کام آسان ہے یہی وجہ ہے کہ ڈرائیور کو نوکری ملنا اب مشکل ہوگئی ہے، اس کے برعکس لوگ باورچی کا کام نہیں سیکھتے جبکہ مارکیٹ میں اِس کی مانگ زیادہ ہے۔ سو، اپنی تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے نوجوان اُس ہنر کا تعین کر سکتے ہیں جس کی معاشرے میں مانگ ہو اور پھر وہ اُس میں کمال حاصل کر کے اپنی زندگی کو بدل سکتے ہیں، یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں۔

نوجوانوں کے لیے آخری مشورہ...... محبت کریں۔ انسانوں میں خامیاں ہوتی ہیں، انسانوں کو اُن کی خامیوں سمیت قبول کریں اور اُن سے محبت کریں، اگر آپ کو کسی شخص میں کوئی برائی نظر آتی ہے تو آپ اُس برائی کو اپنائے بغیر بھی اُس شخص سے محبت کر سکتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے آپ کی اپنی ذات میں خرابیاں ہوں گی مگر اس کے باوجود آپ خود سے محبت کرتے ہیں، یہی اصول دوسرے انسانوں کے لیے بھی اپنائیں۔ ہمارے معاشرے کو اِس محبت کی اشد ضرورت ہے۔

[بشکریہ: روزنامہ جنگ]

کوکب شہزاد

دو مشکل باتیں

جونہی ہم ذہنی بلوغت کو پہنچتے ہیں، ہمیں دو انتہائی مشکل اور پیچیدہ باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک کا تعلق ضمیر کے ساتھ ہے اور دوسرے کا آنکھوں کے ساتھ۔ ان دونوں کی کشمکش میں فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے اور فیصلہ بدلتا رہتا ہے۔ انتہائی مضبوط قوّت فیصلہ اور اللہ پر یقین ہی صحیح فیصلہ کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جہاں تک ضمیر کا تعلق ہے تو اس معاملے میں اپنے شعور کو بیدار رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ القیامہ میں فرمایا ہے کہ اس نے انسان کے اندر نفس بنایا اور اسے نیکی اور بدی دونوں کا شعور دیا۔ البتہ یہ زندگی آزمائش کے لیے ہے۔ نیکی کی طرف بلانے کے لیے اللہ کے رسول اور نبی مستقل آتے رہے اور گمراہی کی طرف بلانے کے لیے شیطان کے داعیات ہر طرف موجود ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا تو فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو تعظیم کا سجدہ کریں۔ فرشتوں نے تو فوراً سجدہ کر دیا لیکن شیطان تکبر کا شکار ہو گیا اور اس نے کہا کہ مجھے آگ سے بنایا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ لہٰذا میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حکم عدولی کی بنا پر اسے دور ہونے کا حکم دے دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی سرکشی پر معافی مانگتا اور توبہ کرتا۔ مگر وہ اپنی ڈھٹائی پر مصر رہا اور اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اسے مہلت دے کہ وہ انسان کو دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے سے گمراہ کرے اور ان سے جہنم کو بھر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت دے دی اور فرمایا کہ میرے اچھے لوگ تیرے چنگل میں نہیں آئیں گے۔ اب یہ کشمکش جاری ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے اپنی طرف بہکانے کی کوشش کی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی کہ میں اپنے مالک کے ساتھ خیانت نہیں کرنا چاہتا۔ ان کے دل سے نکلی ہوئی دعا

کو اللہ تعالیٰ نے قبول کرلیا اور انھیں گناہ سے بچالیا۔

جہاں تک آنکھوں سے متعلق بات کا تعلق ہے تو مخالف جنس کو دیکھنے اور اس کو گھورنے کے معاملے میں غض بصر یعنی نظروں کو جھکا کر رکھنا چاہیے۔ کسی بھی غیر اخلاقی حرکت کی ابتدا آنکھ سے ہوتی ہے اور اگر کنٹرول نہیں کیا جائے تو زنا تک پہنچ جاتی ہے۔

ہمارے دین کا مقصد تزکیہ نفس پیدا کرنا ہے اور روحانی پاکیزگی حاصل کرنا ہے۔ اگر ہم اپنے دل کے فیصلوں اور آنکھوں کی پہنچ کی حفاظت کریں اور انھیں اللہ کی حدود کے اندر رکھیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابدی بادشاہی کے حق دار بن جائیں گے۔ یہ دنیا عارضی اور وقتی ٹھکانہ ہے۔ یہاں کی کسی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مقابلہ اگر کرنا ہے، دوڑ اگر لگانی ہے تو اس عارضی چمک دمک میں نہیں بلکہ اصل زندگی میں مقابلہ کریں۔ ہر منفی خیال شیطان کی طرف سے ہوتا ہے تاکہ وہ ہمیں ناکام و نامراد کر کے اپنا انتقام لے سکے۔

عاقب اشعر

میں اور وہ

وہ بہت طاقتور ہے بہت زیادہ۔۔۔اُس کے بازو کی مچھلیاں ہمہ وقت پھولی رہتی ہیں۔اُس کی چھاتی چوڑی اور مضبوط ہے،قد مجھ سے کوئی تین چار فُٹ زیادہ۔۔۔دانت نکیلے اور بے حد تیز ہیں۔۔۔پورا جسم بالوں سے بھرا ہے اور اُس کے انگ انگ سے بدبو کے بھبھکے اُٹھتے ہیں۔۔۔۔

اُسے جسمانی طور پر تو مجھ پر برتری حاصل ہے ہی، وہ انتہائی مکّار اور چالباز بھی ہے۔۔۔۔روز اُس سے جنگ ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات دِن میں کئی کئی بار۔۔۔وہ مجھے سر تک بلند کر کے پٹخ دیتا ہے۔۔۔میرا جوڑ جوڑ دُکھنے لگتا ہے تو اپنے نوکیلے دانتوں سے میرا جسم جگہ جگہ سے اُدھیڑ دیتا ہے۔۔۔میری رگوں سے خون تک نچوڑ لینا چاہتا ہے۔۔۔

اور جَب میں ادھ مُوا ہو جاتا ہوں تو تَب وہ فاتحانہ انداز سے اپنے سینے پہ زور سے دوہتھڑ مار کر اپنی کمین گاہ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔۔۔اگر میں کوئی اور حربہ استعمال کرنے کی کوشش کروں تو اُس کے پاس اس کا توڑ بھی ہوتا ہے وہ بہت چالاک ہے میں اُس سے نہیں جیت سکتا۔۔۔شاید کبھی نہیں۔۔۔

ہاں پہلے جَب وہ اتنا طاقتور نہیں تھا تو کبھی کبھی میں اُسے ہرانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔۔۔تَب وہ اگلی دفعہ نئی چال چلتا تھا لیکن پھر بھی میں اُسے چِت کر ہی لیتا تھا۔۔۔مگر اب۔۔۔۔اب نہیں۔۔۔اب اُس سے لڑتے لڑتے میں ہانپ جاتا ہوں وہ مجھے روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیتا ہے۔۔۔

لیکن یہ میرا اپنا کیا دھرا ہے وہ کبھی اتنا طاقتور نہیں تھا۔۔۔پہلے پہلے تو بالکل نحیف بدن اور

ڈرپوک ہوتا تھا۔۔۔ چالباز تب بھی تھا مگر طاقت میں کم ہونے کی وجہ سے میرے سامنے اِس کی ایک نہ چلتی تھی۔۔۔لیکن پھر میں نے خود اِس کی طرف سے غفلت شروع کردی۔۔۔صبح وشام اِس کی من پسند خوراک اسے بہم پہنچانے لگا۔خواہشوں کی بےلگام تکمیل کرکے۔۔۔۔قلب ونظر کو آوارہ چھوڑ کے۔۔۔۔۔خود کو غصے اور جذبات کے حوالے کرکے۔۔۔۔۔جب اِسے وافر مقدار میں اپنی خوراک مِلنے لگی تو یہ طاقت پکڑتا گیا۔۔۔میں نے کوئی دھیان نہ دیا۔۔۔یہ سَر کَش اور مُنہ زور ہوگیا۔۔۔میں نے پروانہ کی اور کرتے کرتے آج کے دِن یہ اتنا طاقتور ہوگیا ہے کہ اِس کے سامنے اب میں بےبَس ولاچار ہوں۔۔۔۔اِس نے مجھے چاروں خانے چِت کیے رَکھا ہے۔۔۔

لیکن نہیں میں نے اِس کی غلامی تسلیم نہیں کرنی۔۔۔ ہمت نہیں ہارنی۔۔۔شکست تسلیم نہیں کرنی کسی بھی صورت۔۔۔ میں نے ہر روز یہ جنگ لڑنی ہے۔۔۔بھلے میں روز ہی اِس سے پٹوں مگر اِس کے سامنے سرنڈر نہیں کرنا۔۔۔انشاءاللہ، ایک دِن میری فتح ضرور ہوگی اور یہ موذی اپنی پرانی حالت کو لوٹ جائے گا۔۔۔۔کیونکہ اَب میں کفن باندھ کے میدان میں اتر آیا ہوں، یہ جنگ موت تک ایسے ہی جاری رہے گی۔۔۔

لیکن یہ جنگ سَب سے مُشکل جنگ ہے۔۔۔۔یہ اپنے ساتھ جنگ ہے۔۔۔۔نَفس کے عفریت کی جبلّی خصلتوں کو سدھارنے کی جنگ ہے۔۔۔ اپنے ہی مادی وجود کی سرکش خواہشات پر قابو پانا کیسا ہے اب جا کر پتا چلا۔۔۔۔اب سمجھ آئی ہے کہ۔۔۔نفس کے ساتھ جہاد کو جہادِ اکبر کا نام کیوں دیا گیا۔۔۔

بس ربِ کائنات سے دُعا ہے کہ ہمارے اندر جاری اِس جنگ میں ہماری مدد فرمائے۔۔۔آمین۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (55)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی درست اساسات: محبت، شکر اور نصرت

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی درست اساست میں پچھلی دفعہ ہم نے ایمان، یقین، اسلام اور قنوت پر بات کی تھی۔ ہم نے یہ دیکھا کہ ایمان اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے۔ یہ ایمان ایک آبائی عقیدہ نہیں بلکہ اس سچائی کی دریافت کا نام ہے جس کی تائید میں پوری کائنات کھڑی ہے۔ یوں ایمان یقین کی منزل کا مسافر بن جاتا ہے۔ اس سفر کا زادِ راہ اپنے مالک کی فرمانبرداری اور اس کے احکام کی بجا آوری کا وہ جذبہ ہوتا ہے جس میں انسان خود کو اپنے رب کے حوالے کر دیتا اور اس کی بات ماننے کو مقصدِ زندگی بنا لیتا ہے تاکہ دنیا و آخرت میں وہ اپنے مالک کے سامنے سرخرو ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی ایک دوسری اساس محبت، شکر اور اس کے دین کی مدد و نصرت کا جذبہ ہے۔ اس پر آج ہم تفصیل سے بات کریں گے۔

محبت، شکر اور نصرت

انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو خود کو ایک مہربان ماں کی آغوش شفقت میں پاتا ہے۔ وہ ایک شفیق باپ کی گھنی چھاؤں میں پروان چڑھتا ہے۔ اپنے اردگرد محبت اور رحمت نچھاور کرنے والے رشتے پاتا ہے۔ اپنی ہر ضرورت کی تکمیل کے تمام اسباب بلا سعی و جہد پاتا ہے۔ انسان جب شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ انسان جس دنیا میں رہتا ہے وہاں زمین سے آسمان تک نعمتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔ غذا

پیدا کرنے والی زرخیز دھرتی ہے۔ بارش برسانے والا آسمان ہے۔ لمحہ لمحہ زندگی بخشنے اور باقی رکھنے والی شفاف فضا ہے۔ کام کے لیے روشن دن ہے۔ آرام کے لیے پرسکون رات ہے۔ ذوق جمال کی تسکین کے لیے کہیں سبزہ ہے تو کہیں فطرت کے رنگ ہیں۔ کہیں پرندوں کی چہچہاہٹ ہے تو کہیں پھولوں کی خوشبو ہے۔ آسمان کبھی چاند کی روشنی سے خود کو منور کرتا، کبھی سورج کی شفق کی ردا اوڑھتا اور کبھی تاروں کی چادر سے خود ڈھانک لیتا ہے۔

ایسے میں ایمان کی روشنی یہ بتاتی ہے کہ یہ سارے اہتمام کرنے والی ایک ہی ہستی ہے۔ اسے وجود دینے والی، شفیق والدین کی محبت میں اسے پروان چڑھانے والی، زمین و آسمان میں نعمتوں کا دسترخوان بچھانے والی ایک ہی ہستی ہے۔ یہ اس کا خالق، اس کا مالک اور اس کا پروردگار ہے۔ یہ حقیقت جانتے ہی انسان کا دل اپنے مالک کی محبت سے بھر جاتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں کوئی کسی کو بلا معاوضہ کچھ نہیں دیتا وہاں یہ انمول نعمتیں اتنی ارزاں اور اتنی کثرت سے دیکھ کر انسان اس عظیم رب کی شکر گزاری پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ وہ ہستی جس نے انسان کو سب کچھ دیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ یہی محبت اور یہی شکر خدا سے تعلق کی وہ اساس ہے جو اگر نکل جائے تو پھر ایمان کی جگہ کفر لے لیتا ہے اور شکران نعمت کی جگہ کفران نعمت کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ اگر موجود ہو اور کماحقہ موجود ہو تو انسان بندگی کی معراج پا لیتا ہے۔

خدا کی نعمت بھری اس دنیا میں ایک مومن کے لیے سب سے بڑی نعمت ہدایت کی نعمت ہوتی ہے جو دین کی شکل میں اسے محفوظ طریقے پر ملی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نعمت کو پا کر اسے اپنی زندگی بنا لیتا ہے۔ اور کسی موقع پر اگر دین کو مدد کی ضرورت ہو تو محبت کا جذبہ حمیت وحمایت میں ڈھل جاتا ہے۔ پھر انسان اپنی ہر ممکن کوشش کر کے اپنے وقت، پیسہ، صلاحیت اور حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی نصرت دین کے لیے وقف کر دیتا ہے اور اس راستے میں جان تک دینے کے لیے تیار

ہو جاتا ہے۔محبت اور شکر گزاری کے ساتھ نصرت دین کا یہ جذبہ خدا سے تعلق کی وہ اساس ہے جو نہ صرف ایمان کا اعلیٰ ترین اظہار ہے بلکہ روز قیامت انسان کو خدا کی بہترین نعمتوں کا امیدوار بھی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ محبت، شکر گزاری اور نصرت دین جس شخص کی زندگی میں نہیں ہے، اس کا ایمان درحقیقت ابھی وہ ایمان بنا ہی نہیں جس کا مطالبہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

قرآنی بیانات

''جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں۔''، (البقرہ 2: 165)

''ایمان والو، تم میں سے جو اپنے دین سے پھرے گا، (اللہ کو اُس کی کچھ پروا نہیں ہے)، اِس لیے کہ اللہ عنقریب ایسے لوگ اٹھا دے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے، مسلمانوں کے لیے نرم اور اِن منکروں کے مقابل میں نہایت سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور (اِس میں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ (اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق) جس کو چاہے گا، عطا فرمائے گا۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے۔''، (المائدہ 5:54)

''لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار بن کر رہو، میری ناشکری نہ کرو۔''، (البقرہ 2: 152)

''اور تمھیں ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی، عطا فرمایا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں گن سکتے۔ (اِس پر بھی خدا کے شریک ٹھیراتے ہو)؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔''، (ابراہیم 14: 34)

''اور یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میری سزا بھی بڑی سخت ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ اگر تم ناشکری کرو اور زمین کے سارے لوگ بھی (اِسی طرح) ناشکرے ہو جائیں (تو خدا کا کچھ

نہیں بگاڑو گے)، اِس لیے کہ اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔''،(ابراہیم 14 :8-7)

''پھر جب سلیمان نے اُس کو اپنے سامنے رکھا ہوا دیکھا تو پکار اٹھا کہ یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکرگزار ہوتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے (تو یہ بھی اُسی کا نقصان ہے)، اِس لیے کہ میرا پروردگار بے نیاز ہے اور وہ بڑا اکرم فرمانے والا بھی ہے۔''، (النمل 27:40)

''(خدا کے بندو)، اگر تم شکرگزاری اختیار کرو اور سچے مومن بن کر رہو تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں عذاب دے۔ اللہ تو بڑا قبول کرنے والا اور (ہر چیز کا) جاننے والا ہے۔''، (النساء 4:147)

''اگر تم ناشکری کرو گے تو (اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو گے)، اِس لیے کہ اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ ہاں، وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر شکرگزار ہو گے تو اُس کو وہ تمھارے لیے پسند کرے گا۔ (یاد رکھو، قیامت کے دن) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تمھاری واپسی تمھارے پروردگار ہی کی طرف ہوگی، تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو، وہ تمھیں بتا دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔''،(الزمر 39:7)

''ایمان والو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا: کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ اپنے کفر پر جما رہا۔ پھر ہم نے ایمان والوں کی اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں مدد کی تو وہی غالب ہو کر رہے۔''، (الصّف 61:14)

''ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور (اِن دشمنوں کے مقابلے میں) تمھارے پاؤں جما دے گا۔''،(محمد 47:7)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (59)

ریحان صاحب مزید لکھتے ہیں:

''دوسری صدی ہجری کے نصف اول تک کے یہ وہ حالات ہیں جن میں ایک طرف مسلم معاشرے میں مال و دولت کی بے پناہ کثرت تھی اور دوسری طرف مستقل جنگ و جدال اور بدامنی کا ماحول تھا۔ان حالات میں ایک مسلمان کی ضرورت تھی کہ مادیت کے ماحول میں اس کے روحانی ارتقا اور بدامنی کی فضا میں ذہنی وقلبی سکون کے لیے مذہبی قیادت آگے آتی اور قرآن پاک کی روشنی میں اس کی رہنمائی کرتی۔ بدقسمتی سے یہ نہیں ہوسکا۔

صالحین کی ایک بڑی تعداد مستقل جنگوں میں مصروف رہی، چاہے وہ خارجی قوتوں کے خلاف تھیں یا بنوامیہ کے خلاف ہونے والی بغاوتوں کی شکل میں۔ باقی اہل علم کی توجہ ایک عظیم مسلم ریاست کے قانونی نظام کی تشکیل کے لیے فقہی سرگرمیوں میں صرف ہونے لگی۔فقہا کی آرا کے ردعمل میں لوگوں نے دینی احکام کو احادیث سے جمع کرنے کی کوشش شروع کردی۔ائمہ اربعہ کا کام دوسری اور تیسری صدی میں سامنے آیا۔ اسی عرصے میں صحاح ستہ کی تدوین ہوئی۔ مسلمان اہل علم فقہ اور حدیث کی تدوین سے فارغ ہوئے تو یونانی فکر وفلسفہ سے مسلم معاشرے میں در آنے والے کلامی مباحث کی طرف متوجہ ہوگئے۔ چوتھی صدی کے نصف اول میں امام ابوالحسن اشعری (م 324ھ) اور امام ابومنصور ماتریدی (م 332ھ) جیسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے عقائد کے حوالے سے پیدا ہونے والے کلامی مباحث پر علمی کام کیا۔

اس جائزے سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں جب مستقل خانہ جنگی کی وجہ سے ذہنی پریشانی اور مال ودولت کی فراوانی کی بنا پر پیدا ہونے والے روحانی خلا اور اخلاقی

بگاڑ جیسے مسائل کوحل کرنے کی ضرورت تھی، مسلمان اہل علم کی ترجیحات جنگ و سیاست، فقہ و حدیث اور فلسفہ وکلام بنی رہیں۔

ابتدائی صدی میں اس صورتحال میں ایک نمایاں استثنا حسن بصری (م110ھ) کا تھا۔آپ ایک جلیل القدر تابعی، مفسر اور محدث تھے۔ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پرورش پانے والے حسن بصری (پیدائش 21ھ) نے صحابہ کرام کا کافی زمانہ پایا۔اپنے دور کے انتشار اور صحابہ کرام کے دور کے بعد آنے والے اخلاقی انحطاط کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے خلاف بھرپور جدو جہد کی۔وہ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نظر، صاحبِ درد اور قادرالکلام خطیب بھی تھے۔ان کے مواعظ کی اثر آفرینی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں ان کے کلام کو نبیوں کے کلام کی طرح قرار دیا۔

ان کی کوششوں کے نتیجے میں ایک فضا پیدا ہوئی مگر بدقسمتی سے ان کے بعد یہ میدان اہل علم کی دلچسپی کا موضوع نہ بن سکا۔جبکہ معاشرے کی اخلاقی تربیت کرنا اور ربانی تعلق کی درست جہت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرنا بہرحال معاشرے کی ضرورت تھی جو اُس دور کے معروضی حالات میں زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔اس کے نتیجے میں ایک زبردست خلا پیدا ہوا۔انسانی ضروریات کی طلب سے پیدا ہونے والا کوئی خلا کبھی باقی نہیں رہتا۔یہ خلا تصوف کی تحریک نے بھر دیا۔مسلم معاشرے کے زہد اور غیر مسلم فلسفوں اور روایات سے متاثر تصوف کی تحریک اس فضا میں غیر محسوس طریقے سے اپنی جگہ بناتی چلی گئی اور دوسری اور تیسری صدی میں عوام و خواص دونوں میں مقبول ہوگئی۔

مسلم دنیا میں تصوف کا عروج و زوال

تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد جب عباسی خلفا کے زیر حکومت مسلم معاشرہ علمی، تمدنی،

معاشی اور معاشرتی پہلو سے اپنے عروج پر تھا، اسی دور میں تصوف کی روایت بھی وقت کے بہترین لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی (م 297ھ)، شیخ بایزید بسطامی (م 261ھ)، شیخ سری سقطی (م 253ھ)، شیخ ذوالنون مصری (م 245ھ)، شیخ ابو بکر شبلی (م 334ھ) اور شیخ ابوالقاسم گرگانی (م 450ھ) جیسے اکابرین نے اگر تصوف کی عملی روایت کو منتہائے کمال پر پہنچایا تو سہل بن عبداللہ تستری (م 283ھ)، شیخ ابو طالب مکی (م 386ھ)، امام ابوالقاسم قشیری (م 465ھ)، شیخ علی ہجویری (م 465ھ)، امام غزالی (م 505ھ)، شیخ عبدالقادر جیلانی (م 561ھ)، شیخ شہاب الدین سہروردی (م 632ھ)، شیخ ابن عربی (م 638ھ) اور جلال الدین رومی (م 672ھ) جیسے صوفیوں نے عملی روایت کے ساتھ علم اور قلم کی طاقت کے ساتھ تصوف کے اسرار و رموز کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کیا۔

تاہم پانچویں صدی ہجری میں تصوف کا افراط و تفریط سامنے آنے لگا تھا۔ اس لیے اس پر شدید تنقید شروع ہوگئی۔ پانچویں صدی میں اس تنقید کا آغاز ابن حزم (م 456ھ) نے کیا۔ چھٹی صدی میں ابن جوزی (م 597ھ) اور پھر ابن تیمیہ (م 728ھ) اور ان کے شاگرد ابنِ قیم (م 791ھ) نے اس تنقید کو عروج پر پہنچا دیا۔

یہ تنقید آنے والے زمانے میں اگر جاری رہتی تو بہت عرصے قبل ہی تصوف کی روایت ختم ہوجاتی یا کم از کم اس کا اثر بہت محدود ہو جاتا۔ تاہم اس عرصے میں مسلم دنیا کو ایک زبردست سانحے کا سامنا کرنا پڑا جس نے نہ صرف مسلمانوں کی علمی روایت کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا بلکہ وہ حالات پیدا کر دیے جن میں لوگوں کے لیے سکون و عافیت کی واحد جائے پناہ گوشہ تصوف تھا۔''

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

غزل

جیسے تیسے گزارا ہوتا ہے
بس خدا کا سہارا ہوتا ہے

بوجھ اپنا نہیں سنبھلتا اب
دوسرا غم تمہارا ہوتا ہے

جس کو جو بھی یہاں پہ ملتا ہے
کھیل قسمت کا سارا ہوتا ہے

کیا تجھے کچھ خبر بھی ہوتی ہے؟
میں نے جب بھی پکارا ہوتا ہے

اپنوں کو چھوڑنا بہت مشکل
اپنا پن سب کو پیارا ہوتا ہے

ڈوبنے والا کیا کرے آخر؟
ساحلوں پر کنارا ہوتا ہے

یاں پلک بھی مری جھپکتی نہیں
آسماں پر ستارا ہوتا ہے

کوئی جچتا نہیں نگاہوں میں
بس وہی اک نظارا ہوتا ہے

اس لیے تیری سمت دیکھتی ہوں
حکم تیرا ہی سارا ہوتا ہے

حنا تیار ہے سفر کے لیے
دیکھئے کب اشارا ہوتا ہے

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجیے......یا
ایک پے آرڈر / بینک ڈرافٹ بنام ''ماہنامہ انذار'' بینک الفلاح المحدود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوائیے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

Monthly
INZAAR

NOV 2018
Vol. 06, No. 12
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi